کلامِ اقبال میں تارے کی معنوی جہات

ڈاکٹر شمیم احمد

سینٹ اسٹیفنز کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

علامہ اقبال نے اپنے پیغام کی ترسیل کے لیے اظہار کے مختلف اسالیب کو اس طرح برتا کہ ان کا کلام فکر وفن کے اعتبار سے خصوصی انفرادیت کا حامل ہو گیا۔ اس میں اعلیٰ ادبی شان پیدا ہو گئی، معنی کی ایک دنیا آباد ہو گئی جو قاری کو نئے نئے جہانوں کی سیر کراتی ہے، نئے نئے اشخاص سے روشناس کراتی ہے، نئے نئے موضوعات پر سیر حاصل تبصرے کرتی ہے، شاعری کی نئی سے نئی تحسین کا موقع فراہم کرتی ہے اور لطافت وخطابت سے آمیز مخصوص اندازِ بیان سے اردو ادب کو عالمی معیار عطا کرتی ہے۔ فطرت کے مشاہدات کا بیان اردو شاعری میں نیا نہیں، ہر عہد میں ہر شاعر نے اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق فطرت یا قدرتی مظاہر کے بیان سے اپنے کلام کو زینت بخشی ہے۔ تاہم فطرت کے مشاہدات کی جو افراط علامہ اقبال کے کلام میں نظر آتی ہے وہ ہمارے دوسرے شعرا کے یہاں ناپید ہے۔ بات صرف افراط کی نہیں، اقبال نے فطری مظاہر کے بیان سے جو کام لیا ہے جس طرح انھیں زبان عطا کی ہے اور ان کے ذریعے اپنے پیغام میں زور اور تاکید پیدا کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اولین مجموعۂ کلام کا تو آغاز ہی فطرت کے ایک بہت بڑے مظہر 'ہمالہ' سے ہوتا ہے اور اسی نظم سے بانگِ درا کا مزاج اور آہنگ طے ہو جاتا ہے کہ یہ کلام ہمالہ ہی کی طرح بلند، گردشِ ایام کے اثرات سے پاک اور آفاقی نوعیت کا حامل ہے۔ اقبال نے اس نظم میں ہمالہ کی چوٹیوں کو ثریّا سے سرگرمِ سخن قرار دیا ہے جب کہ ان کے کلام کا مطالعہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ بہ نفسِ نفیس ثریا سے سرگرمِ سخن ہیں۔ بلکہ وہ تو ثریا کو بھی خاطر میں نہیں لاتے، ان کی نظر تو اس مقام پر رہتی ہے جہاں تک رسائی انجم کو سہا دیتی ہے، اندیشوں میں مبتلا کر دیتی ہے کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل کی معراج پر نہ پہنچ جائے۔

فطرت کے دیگر مظاہر کے مقابلے اقبال نے اپنے کلام میں جس کثرت سے تاروں کا ذکر کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اس مظہر سے خصوصی شغف ہے۔ تمام کلام میں جا بجا بکھرے تاروں اور ستاروں کے حوالوں سے قطعِ نظر صرف بانگِ درا میں ہی ۷ نظمیں ایسی ہیں جو براہِ راست ستاروں کے عنوان پر ہیں۔ صبح کا ستارہ، اخترِ صبح، چاند اور تارے، ستارہ، دو ستارے، بزمِ انجم اور 'شبنم اور ستارہ' میں اقبال نے ان تاروں کے ذریعے اپنے پیغام کو روشن وتابناک بنایا ہے۔ کسی نظم میں ان تاروں کو اپنے ڈوبنے کا خوف ستاتا ہے۔ کسی نظم میں یہ تارے اپنی تھکن کا اظہار کرتے ہیں اور چاند ان مزرعِ شب کے خوشہ چینوں کو مشورہ دیتا ہے کہ جنبش سے ہے زندگی جہاں کی۔ کسی نظم میں دو ستارے آپس میں ملنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں، لیکن جانتے ہیں کہ وصال کی یہ تمنا سراپا فراق کا حکم رکھتی ہے۔ کہیں انھیں تاروں کو شرابِ تقدیر میں مست قرار دے کر اور انھیں زندانِ فلک میں پابہ زنجیر بتا کر قدرت کی اس ستم ظریفی کا شکوہ کیا ہے:

کوئی نہیں غم گسارِ انساں
کیا تلخ ہے روزگارِ انساں

نظم بزمِ انجم میں انہی تاروں کی زبانی اقبال نئے اصولوں اور نئے قوانین کو پرکھنے اور اختیار کرنے کا وہ پیغام سناتے ہیں جو ضرب المثل کے طور پر موقع بہ موقع دہرایا جاتا ہے:

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے، قوموں کی زندگی میں

تاروں کی زبانی اقبال کا پیام نظم کے آخری دو اشعار میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچتا ہے اور تارے فرماتے ہیں:

اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے
جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں
ہیں جذبِ باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

اتحاد ویگانگت کا یہ پیغام اقبال کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے جس

میں انھوں نے دریا اور موج کی تمثیل سے یکجہتی کا پیغام دیا ہے:

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

تاروں کے موضوع پر بانگِ درا کی ان سات مستقل نظموں کے علاوہ دیگر متعدد نظموں میں تاروں کے حوالے ملتے ہیں۔ نظم رات اور شاعر میں تو اقبال نے ان تاروں سے ہم کلامی کا اعلان کر دیا ہے، اس نظم کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں رات شاعر سے سوال کرتی ہے:

کیوں میری چاندنی میں پھرتا ہے تو پریشاں
خاموش صورتِ گل، مانندِ بو پریشاں
تاروں کے موتیوں کا شاید ہے جوہری تو
مچھلی ہے کوئی میرے دریائے نور کی تو
یا تو مری جبیں کا تارا گرا ہوا ہے
رفعت کو چھوڑ کر جو پستی میں جا بسا ہے

تاروں کے موتیوں کے جوہری اقبال شاعر کی حیثیت سے نظم کے حصہ دوم میں اپنی اُن کیفیات کا بیان کرتے ہیں جنھوں نے ان کے دل کو جکڑ رکھا ہے اور جس کے سبب عزلتِ شب میں اشک بہے جاتے ہیں۔ وہ ایسی فریاد اپنے دل میں لیے بیٹھے ہیں جسے سنانے کے لیے ایسے لوگ نہیں ملتے جن کو دل اپنی فریاد سنانا چاہتا ہے، تپشِ شوق کے نظارے دیکھنے والا بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ چناں چہ نظم اپنے اختتام پر پہنچ کر فیصلہ سناتی ہے:

ضبطِ پیغامِ محبت سے جو گھبراتا ہوں
تیرے تابندہ ستاروں کو سنا جاتا ہوں

بانگِ درا کی ایک غزل میں بھی اقبال نے کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے:

رلاتی ہے مجھے راتوں کو خاموشی ستاروں کی
نرالا عشق ہے میرا، نرالے میرے نالے ہیں

قیامِ یورپ کا یہ وہ عہد ہے جب اقبال کے ذہن و دل پر عزلت و تنہائی کی ایک عجیب کیفیت طاری ہے۔ ایک گھٹن کا احساس ہے، دل بہت کچھ کہنے کو بے قرار ہے دماغ میں طوفان برپا ہے، لیکن ابھی طلب پوری نہیں ہوئی ہے اور یہی احساس ہائیڈل برگ کے دریائے نیکر کے کنارے ایک شام چاند تاروں، شاخوں، وادیوں اور کہسار کی خاموشی کے سبب ان سے یہ اشعار کہلواتا ہے:

تاروں کا خموش کارواں ہے
یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل! تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

اگلی ہی نظم 'تنہائی' میں یہ سکوت، یہ خاموشی اپنا ہم نفس ڈھونڈ لیتی ہے اور اقبال استفہامیہ انداز اختیار کرتے ہوئے دلِ بے قرار کو تاکید و تنبیہ کرتے ہیں:

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا؟
انجم نہیں تیرے ہم نشیں کیا؟

انجم کی اس ہم نشینی اور قدرت کے مظاہر پر حالتِ تنہائی میں غور و تدبر نے بالآخر علامہ اقبال کو تاروں کے متعلق ایک نئی بات سجھائی اور اب یہ تارہ امتِ مسلمہ کا استعارہ بن گیا۔ بانگِ درا ہی کی ایک نظم خطاب بہ جوانانِ اسلام میں پہلی مرتبہ اقبال نے تارے کو نوجوان مسلم کے استعارے کے طور پر استعمال کیا:

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے؟
وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟

اگلے چند اشعار میں اسلام کے ابتدائی زمانۂ عروج کی داستان سنانے کے بعد مذکورہ استعارے کی استقامت کا حکم لگانے کی غرض سے یہ بھی کہہ دیا:

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

آسماں نے بے شک ثریا سے ہمیں زمیں پر دے مارا ہو، لیکن اوجِ ثریا پہ مقیم ہونے کی تڑپ کسی صورت ختم نہیں ہوتی اور جواب شکوہ میں علامہ اقبال خدا تعالیٰ کی زبانی اوجِ ثریا پر مقیم ہونے کی انسانوں کی چاہت کا بیان کرتے ہیں اور پھر اس بات کا بھی کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمان انجم کی مانند افقِ قوم پہ روشن تھے۔ موجودہ صورتِ حال اس کے برعکس سہی، لیکن کم از کم خود اقبال کو اپنی والدہ مرحومہ کی تربیت کے اعتراف کے طور پر یہ کہنے میں تامل نہیں:

تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا

طلوعِ اسلام اقبال کی وہ شاہکار نظم ہے جس میں انھوں نے

مسلمانوں کو صداقت، عدالت اور شجاعت کا سبق ایک بار پھر پڑھنے کا مشورہ دیا ہے کہ اسی راستے پر چل کر وہ دنیا کی امامت کا بڑا کام انجام دے سکتے ہیں۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کی عزت وتوقیر میں کمی اس بات کا اشارہ ہے کہ ایک بار پھر اُن کے عروج کا وقت آنے والا ہے کیوں کہ اجالا تبھی ہوتا ہے جب روشنی مدھم ہو جاتی ہے۔ اس نظم کا آغاز اسی مثبت انداز سے ہوتا ہے:

دلیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا، گیا دورِ گراں خوابی

غالب نے بھی خاموش شمع کو دلیل سحر قرار دیا تھا:

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر، سو خموش ہے

اگلے ہی بند میں ایک بار پھر ستاروں کے ڈوبنے کی اسی تمثیل کو ایک اور تاریخی رنگ میں پیش کرتے ہوئے نئی امیدیں اور نئے حوصلے جگائے ہیں:

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

لاکھوں انجم کے خون سے سحر پیدا ہونے کا یہ نکتہ ایک طرف صبح کی آمد کے مثبت پہلو کو بیان کرتا ہے تو دوسری طرف اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ کمزور میں اگر مقابلہ کرنے کی طاقت نہ رہے تو پھر اس کا ہلاک ہو جانا ہی بہتر ہے۔ یہ ہلاکت منفی یا رجائیت پر مبنی فکر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس میں تعمیر کا پیام مضمر ہے کیوں کہ اقبال کو اس بات کا پورا احساس ہے:

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

اسی مثبت فکر نے اقبال کو یہ حوصلہ دیا کہ انھوں نے شہادتِ حسینؓ میں یہ نکتہ اخذ کر لیا:

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

نظم طلوع اسلام کے مذکورہ بالا شعر میں عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹنے کو خونِ صد ہزار انجم سے تشبیہ دے کر اقبال نے انجم کو ایک نئے علامتی معنی دیے۔ اقبال سے پہلے ستاروں کو آرائش وزیبائش کی علامت کے طور پر تو استعمال کیا گیا، لیکن اسے مسلمان قوم یا مسلم کی علامت کے طور پر اقبال نے استعمال کیا۔ اقبال کے علائم ورموز کے بارے میں سید عابد علی عابد نے لکھا ہے:

اقبال ان شعرا میں سے ہیں جو نہ صرف اپنے کلام کی ادبی خوبیوں کی وجہ سے جاذبِ توجہ ہوتے ہیں بلکہ اپنے مطالب و معانی کے اعتبار سے بھی تحقیقی مطالعے کا موضوع بنتے ہیں۔ ان کے یہاں یہ بات بھی ہے کہ انھوں نے تغزل اور تصوف کے ذخیرۂ علامات ومصطلحات میں سے اکثر الفاظ وتراکیب کو اپنے معانیِ قدیم سے جدا کر کے گویا بہ جبر وقہر سینۂ الفاظ میں ایک روحِ نو پھونکی۔ (شعرِ اقبال، ص: ۲۴۷)

لفظِ انجم میں معانی کی ایک نئی روح پھونکنے کے بعد اسی نظم کے تیسرے بند میں اقبال کی نظر ستاروں سے آگے کے جہانوں کی جستجو کرنے لگتی ہے۔ اب ستاروں کی چکاچوندان کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے کافی نہیں، انھیں اس نیلے آسمان سے آگے بڑھنا ہے:

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون اقبال کے ذہن ودل کا حصہ بن گیا اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں مختلف لفظیات کے ساتھ ادا ہوتا رہا۔ شاید یہ کہ اپنی بہترین صورت میں اس طور پر ادا ہوا کہ ترقی اور کامرانی کی ہر منزل پر نئے حوصلے جگانے کا روزمرہ بن گیا:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

ستاروں سے آگے جہانوں کی جستجو دراصل انسان کی اپنی خلقی اور جبلی خصوصیت کی تسکین ہے۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ ہم سبھی ولادت کے وقت اُفقی طور پر لیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہم میں یہ سکت نہیں ہوتی کہ اٹھ کر کھڑے ہو سکیں تاہم کسی معلم یا تربیت کار کے بغیر ہم خود اٹھنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں اور پیدائش کے وقت اُفقی ہیئت کو عمودی طور پر بلند کرنے کی جستجو میں تقریباً ۳۰ سے ۴۵ ڈگری کے زاویے سے بیٹھنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر یہ ہیئت زاویہ قائمہ یعنی ۹۰ ڈگری کے سیدھے خط کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بلندی کی یہ جستجو ہماری جبلی اور خلقی خصوصیت ہے۔ ہم سیدھے کھڑے ہو کر سیدھے راستے پر استقامت کے ساتھ چلیں۔ اسلام کا تقاضا ہے کہ ہم اخلاقی طور پر درست ہوں اور جب ہم اخلاقی اعتبار سے درست ہوتے ہیں اور اپنی خواہشات کو خدا کے حکم کے تابع کر دیتے ہیں تو ہم مومن کے درجے پر پہنچ جاتے ہیں اور یہی وہ بلندی ہے یہی وہ عشق ہے جس کے امتحان میں ہمیں آگے ہی آگے بڑھنا ہے، ستاروں سے

آگے بڑھنا ہے:

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

لیکن جب شاعرِ مشرق اس انجم کی کج روی کو دیکھتے ہیں، تلاش و جستجو سے ماورا بے عملی کے سمندر میں تن بہ تقدیر غوطے لگاتے دیکھتے ہیں تو بالِ جبریل کی غزل کا یہ مطلع وجود میں آتا ہے:

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟

اس سے بھی آگے بڑھ کر اقبال واشگاف انداز میں اعلان کر دیتے ہیں:

پرانے ہیں یہ ستارے، فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز

نوخیز جہانوں کی جستجو اقبال کو اس مقام پر پہنچا دیتی ہے جہاں وہ جبرئیلؑ سے مخاطب ہو کر یہ کہہ اُٹھتے ہیں:

نہ کر تقلید اے جبرئیل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

بالِ جبریل کی غزلیات میں تو اقبال کا رنگ ہی اور ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برسوں کی بے قراری اور بے اطمینانی نے اقبال کو کسی ایسے بلند ترین مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں انھیں یہ کاروبارِ دنیا ہیچ معلوم ہوتا ہے:

کب تک رہے محکومِ انجم میں مری خاک
یا میں نہیں، یا گردشِ افلاک نہیں ہے

یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر پُر اعتماد اقبال خود کو یہ کہنے میں حق بجانب محسوس کرتے ہیں:

نہ ستارے میں ہے، نے گردشِ افلاک میں ہے
تری تقدیر مرے نالۂ بے باک میں ہے

بے قراری کے جس دور میں اقبال نے انہی تاروں کو اپنا دوست، اپنا ہم نوا اور ہم نشیں سمجھا تھا ان کے ساتھ تنہائی میں وقت گزارا تھا، ان سے گفتگو کی تھی۔ ان کے ہر رات جگمگانے اور ہر صبح ڈوب جانے کو تغیراتِ زمانہ سے تعبیر کیا تھا، اب یہی تارے محض تماشائی کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں:

ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی

تاروں کے متعلق اقبال کے فکری اظہار کا ایک سلسلہ ہے جو ان کے کلام میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ ہماری تہذیبی اور سماجی روایت میں تاروں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ ستاروں کی چال سے انسان کو اس کی تقدیر کا حال پتہ چلتا ہے۔ علم نجوم کی ترقی کے پیچھے یہی سماجی روایت کارفرما رہی کہ تاروں کو پیش گوئی کا ایک اہم مظہر تصور کیا گیا۔ نجومی تقدیر کا حال کہتے اور ہمارے بھولے بھالے عقیدت مند ان کی باتوں پر ایمان لے آتے، لیکن اقبال تقدیر کے نہیں تدبیر کے حامی ہیں۔ وہ عمل اور جد و جہد کے پیامبر ہیں۔ ان کا تقدیر پر ایمان ضرور ہے، لیکن ان کے نزدیک انسان اپنی تقدیر خود تحریر کرتا ہے۔ کسی نجومی یا رمّال کے بہکاوے میں آ کر انسان تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ جائے تو اس سے بڑھ کر زیاں اور کچھ نہیں کیونکہ:

ستارہ کیا میری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں
ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاکِ زندہ ہے تو تابعِ ستارہ نہیں

اقبال کا تفکیری نظام انسان کو نئی دنیاؤں کی جستجو پر آمادہ کرتا ہے۔ انھیں یہ قطعی ناپسند ہے کہ انسان بلا سوچے سمجھے پرانی روایتوں کا اتباع کرتا رہے اور اپنے لیے یا اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق اپنی سوچ کو تبدیل نہ کرے۔ اقبال خاکِ زندہ کو اتباعِ ستارہ کی پابندی سے محدود نہیں کرنا چاہتے۔ وہ جانتے ہیں کہ لامحدود صلاحیتوں کا مالک انسان اپنے اندر جستجو اور عمل کا شوق پیدا کرے تو منزلوں تک رسائی آسان ہو جائے۔ اقبال زندہ فکر کے حامل ایک مفکر ہی نہیں زندہ فن کے سالار فن کار بھی ہیں۔ ان کے یہاں لفظ کسی ایک یا دو معنی کی پابندی نہیں کرتے۔ غالب کی طرح یہی لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم بھی نہیں ہوتے بلکہ اپنے اظہار و استعمال سے معنی کی نئی دنیا لے کر نمودار ہوتے ہیں۔ معنوی جہات کے اعتبار سے اقبال کی لفظیات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ وہ سامنے کے عام لفظوں کو خصوصی معنی عطا کر دیتے ہیں۔ ایسے معنی جو خود فنکار کی شناخت بن جاتے ہیں۔ خودی ہو یا لالہ، عقل و دل ہو یا زماں و مکاں، تدبیر و تقدیر ہو یا جہد و عمل، یہ وہ الفاظ ہیں جن کی زبان سے ادائیگی فوری طور پر اقبال کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ تارہ، انجم اور کوکب ایسے ہی لفظی اظہار ہیں جنھیں اسلوبِ اقبال نے معنی کے نئے جہات عطا کی ہیں اور جو اقبال کی شناخت کا حکم رکھتی ہیں۔

◆◆◆